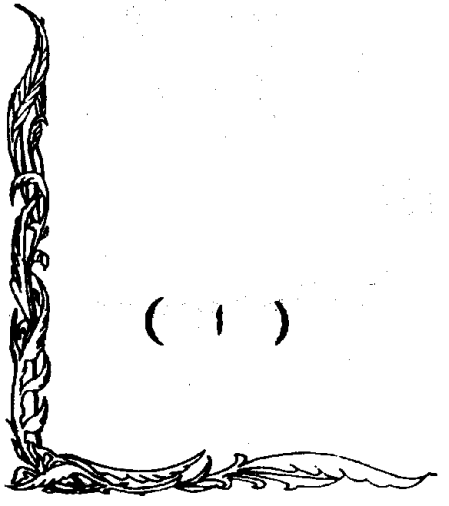

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بِدان اَرشدکَ اللّٰہ فِی الدَّارین"

(جان لے اے طالبِ حق! اللہ تعالیٰ تجھے دونوں جہانوں میں رُشد عطا کرے)

رُشد و ہدایت کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے کہ ایک عام سُوجھ بُوجھ رکھنے والا آدمی بھی جب اپنے گرد و پیش کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو سب سے پہلے اسے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ کائنات کی پیدائش اور اس کے انجام نیز مقاصد کے بارے میں اس کے دل میں کچھ واضح و غیرواضح سوال اٹھتے ہیں اور یہ سوالات جوابات چاہتے ہیں۔

وہ سوچتا ہے کہ یہ کائنات کتنی بڑی ہے؟ اور کیسے وجود میں آئی؟ پھر اسے اس پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ وہ درمیان میں کیسے اور کیوں پیدا ہوا؟ یا پیدا کیا گیا؟ عام طور پر اس کی سوچ کے طویل سلسلے کا آخری سوال یہ ہوتا ہے جو پہلا بھی ہو سکتا ہے کہ ان سب کو پیدا کرنے والا' سنبھالنے والا اور چلانے والا بھی کوئی ہے؟ اگر وہ کچھ زیادہ سمجھ دار ہو تو پوچھتا ہے کہ آیا ان سوالوں کے جوابات دیئے جا سکتے ہیں؟ اور اگر یہ ممکن ہے تو کیا ان کا آپس میں کوئی ایسا ربط ہے کہ اس کے ذہن میں ترتیب سے کوئی بات بیٹھ سکے۔ یعنی جب وہ دنیا کو دیکھے تو اسے یہ اطمینان ہو سکے کہ ہاں اس وسیع و عریض دنیا میں وہ ایک بے معنی وجود نہیں ہے' اس کے یہاں آنے کا کوئی مقصد ہے اور اس مقصد کی طرف اسے کوئی ہدایت دینے والا بھی ہے۔

انسان کا ذہنی' فکری اور روحانی سفرنامہ یہ خبر دیتا ہے کہ ان سوالوں پر غور کرنے کے اہل لوگ صدیوں سے ان کے جوابات سوچتے اور پیش کرتے آئے ہیں۔ سائنس دان' فلسفی اور انبیاء و صوفیا (رحمتہ اللہ علیہما) نے باقاعدہ اپنے اپنے انداز

www.yabahu.com

میں یعنی مشاہدات و تجربات، فکر و نظر اور کشف و وجدان کی روشنی میں ان سوالوں کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ شعراء بھی ان سے پیچھے نہیں رہے، گو وہ ایک نظام کی شکل میں یا منطقی ارتباط کے ساتھ دوسروں کے سامنے اپنی دانائی کا ثمر پیش نہ کر سکے مگر ان کے پر بصیرت نکات بھی کہیں کہیں ضرور رہنمائی کرتے رہے۔

آج کل ایک خیال عام ہے کہ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے لہٰذا سائنس دان اپنی تحقیقات کی روشنی میں بہت سے سوالوں کے جوابات فراہم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ پہلے سائنس دانوں کے نظریات پر ہی ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ کائنات کی ابتداء کے بارے میں سائنس کی سب باتیں حتمی نہیں ہیں۔ اسی طرح کائنات کی عمر اور اس کے سائز کے بارے میں سب آراء قیاسی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ کائنات پھیلتی جا رہی ہے۔ پہلے گویا یہ ایک انڈا تھا جو پھٹا تو اس کے ٹکڑے کہکشاؤں اور ستاروں کی شکل میں بکھر گئے۔ اسی طرح زمین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسکی عمر موجودہ ٹھوس شکل میں کوئی ۴.۶ ملین سال ہوگی۔

ایک رُوسی نژاد امریکی طبیعات دان جارج گیمو نے بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہاکے میں ایک خوفناک دھماکے (بگ بینگ) کو کائنات کی پیدائش کا سبب قرار دیا۔ اس کی مخالفت بھی ہوئی مگر بعد ازاں اسے مان ہی لیا گیا۔ اس نظریے کے مطابق خلا میں ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا اور کائنات آگ کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں پھٹ پڑی۔ خلا میں اس کے ٹکڑے عظیم و مہیب سیاروں اور کروں کی شکل میں گھومنے اور تیرنے لگے۔ پھر کچھ طویل غیر متغیر مدت کے بعد یوں ہوا کہ کوئی بہت بڑا سیارہ سورج کے بہت قریب سے گذرا جس کی کشش سے سورج کی سطح پر بہت بڑی بڑی لہریں پیدا ہوئیں اور اتنی اوپر کو ابھریں کہ جب وہ سیارہ گذر گیا تو چھینٹوں کی مانند الگ الگ ٹکڑے بکھر گئے جو بعد میں منجمد ہو کر کرے بن گئے۔ اب یہ نظامِ شمسی کا حصہ ہیں یعنی اپنے شمس کے گرد گھوم رہے ہیں اور

ہماری زمین انہی میں سے ایک ہے۔

لیکن بگ بینگ سے پہلے کیا تھا؟ اور یہ کائناتی انڈا کہاں سے آیا؟ بعض کا خیال ہے کہ پہلے سب کچھ دھواں دھواں تھا۔ پھر یہ سکڑنے لگا، جمتا گیا اور جب بگ بینگ کا واقعہ پیش آیا تو بے شمار ستارے اور کہکشائیں وجود میں آئیں بلکہ شاید کئی اس سے بھی پہلے بن چکی تھیں۔

اس طرح اجرام کے کئی نظام وجود میں آتے گئے جو ہمارے علم کے مقابلے میں لامتناہی ہیں۔ کئی سورج ہو سکتے ہیں اور کئی دوسرے کرے اور پھر اس نظام کا کوئی اور مرکز ہو سکتا ہے۔ اور اس کی گردش اسی سے متعلق ہو سکتی ہے اور اسی طرح آگے قیاس کرتے جایئے اور بالآخر یہ ہو گا کہ اسے لامحدود سمجھ کر آپ کے فہم و تخیل کو کہیں نہ کہیں ٹھہر جانا پڑے گا۔

کہا جا رہا ہے کہ اب یہ سب کائنات اپنی بے شمار کہکشاؤں اور کروں سمیت پھیلتی جا رہی ہے حتیٰ کہ ممکن ہے، ایک دور میں پھر یہ دھواں دھواں ہو کر رہ جائے لیکن اس کے بعد پھر کوئی ملتا جلتا تخلیقی سلسلہ جاری ہو سکتا ہے جس کے لئے کسی اور سبب کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

کائنات کے ماضی و مستقبل کے بارے میں بزعم خود اگر ایک جامع سوال پوچھا جائے کہ اس کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے کیا تھا اور پھر کیا ہوگا؟ تو سائنس دانوں کے ہاں اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ شاید اس سے پہلے بھی کئی کائناتیں وجود میں آ چکی ہوں اور بعد میں بھی دوسری کئی اور وجود میں آتی رہیں گی جن کے اپنے طبعی اور قدرتی قوانین ہوں اور اپنا ایک الگ سلسلہ روز و شب اور معاملہ حیات و ممات ہو۔

اس وقت جو ہم اپنے گرد و پیش دیکھ رہے ہیں تو اس کے مطابق ہمارا ایک شمسی نظام ہے۔ زمین اور اس کے ساتھ کوئی دس دوسرے کرے قانون کشش کے تحت سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان کے اپنے چاند ہیں جو اپنے کروں کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے پر کئی لحاظ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی

www.yabahu.com

گردش سے دن اور رات وجود میں آتے ہیں' موسم بدلتے ہیں اور حیات کی نشوونما ہوتی ہے۔

اس لا محدود پھیلاؤ میں ہمارے شمسی نظام کا دوسرے نظام ہائے کائنات سے کیا تعلق ہے؟ سائنس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور نہ شاید ہو سکتا ہے کیونکہ سائنس کا علم صرف ظاہری اور ممکن تجربے اور مشاہدے تک محدود ہے۔

اب اس کرہ ارض پر حیات کیسے وجود میں آئی؟ اس کے لئے پھر کئی نظریات سامنے آتے ہیں۔ پہلے ایک مخصوص ابتدائی ماحول اور آب و ہوا میں خلیے وجود میں آئے۔ پھر چند خاص ارتقائی قوانین کے تحت حیات وجود میں آئی۔ جمادات' نباتات' اور حیوانات۔ آخری مرتبہ میں انسان کی پیدائش کی نوبت آئی مگر انسان بھی سائنسی تحقیق کی رو سے اپنے شعور کی بلوغت تک پہنچنے کے لئے کئی صدیوں کے ادوار سے گذرا اور بتدریج اس کے قویٰ کی پختگی اس انتہا تک پہنچی کہ وہ شعور کو کام میں لانے کا اہل ہوا۔

اس تخلیق' حرکت' تغیر اور ارتقاء کو کس طرح ایک حکمت کے تحت وجود میں لایا گیا اور وہ کیا شعور ازلی تھا جو ہر مرحلے پر کارفرما رہا اور اس کے سامنے کیا مقصد تھا یا ہے؟ اور خاص طور پر انسان جو موجودہ سائنس کے نظریہ ارتقاء کی رو سے نشوونمائے ذہنی و جسمانی کے کئی درجوں سے گذر کر یہاں تک پہنچا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اب اس کے ارتقاء کا رخ کس طرف ہے اور کیا اس کا کوئی ذہنی' اخلاقی اور روحانی مقصد بھی ہے؟ اور بایں ہمہ یہ سلسلہ جیسا کچھ بھی ہے' انجام کار کہاں جا کر ختم ہو گا؟ یہ سب باتیں سائنس کے دائرے سے باہر ہیں اور باہر رہیں گی۔ کیا انسان "بحر وجود میں پانی کا ایک بلبلہ' عالم خلق میں ہوا کا ایک جھونکا' میدان تکوین میں مجموعہ غبار کا ایک نقش پا"(۱) ہی ہے یا کچھ اور ؟ ان سوالوں کے جواب کے لئے ہمیں کسی اور طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

ابتدائی سطور میں ایک عام آدمی کے ذہن کے اندر اٹھنے والے سوالات کی

طرف اشارہ کیا گیا تھا جو کسی ترتیب یا تربیت کے بغیر ہوتا ہے۔ اب ایک فلسفی انہی سوالوں کو اپنے حلقہ درس و فکر میں یوں ترتیب دیتا ہے

"یہ سب کیا ہے؟ اور اس میں میرا مقام کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ میرا تعلق کیا ہے؟ اس دُنیا کی نیچر کیا ہے اور میرا اس میں کیا کام ہے؟ یعنی میں یہاں کیا کروں اور کیسے رہوں؟"

"کیا یہ دُنیا مادی اشیاء کا ایک انبار ہے؟ کیا اس میں کوئی حرکت کوئی سمت اور کوئی سرا ہے؟ کیا یہ صرف بھیانک ایٹم کا ایک وحشیانہ رقص ہے یا اندھی elan Vital کی ایک نامعقول گن ہے اور مزید برآں کیا میں اتفاقی پیدائش اور سریع الزوال مدت کے لئے ایک ٹمٹماتا ہوا شعلہ ہوں مکمل نیستی اور عدم کی محض ایک عبوری صورت؟ یا کوئی بہتر شے ہوں ایک ذات جس کی کوئی قدر و قیمت ہے ایک باشعور ہستی جو اپنا ایک وقار اور اس عظیم منصوبے میں کوئی مقصد رکھتی ہے

"یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب فلسفہ دے گا۔ یہ فلسفے کا مسئلہ ہے۔ اس طرح فلسفہ ایک World View پیش کرنے کا دعوے کرتا ہے"(۲)

فلسفے کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک غیر فلسفی طالب علم کو ایک بات کھٹکتی ہے کہ فلسفی بڑے منصوبے باندھتے ہیں اور ان کے ہاں مشکل اور بسا اوقات لاینحل سوال تو اٹھائے ہی جاتے ہیں مگر ان کے ساتھ جوابات فراہم کرنے کے اونچے دعاوی بھی کئے جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے گویا اس وقت عقل و فکر کی حدود و قیود کچھ ان کی نظر میں نہیں ہیں مگر جب فیصلہ سامنے آتا ہے تو وہ اگر برحق بھی ہوتا ہے تو اس فیصلے کے اندر دلائل کے سہارے ہی سہی' اپنے تئیں منوانے کی پوری سکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ مختصر سوالنامہ مرتب کرنے کے بعد فلسفے کے اس بڑے عالم اور استاد نے نہایت ستھرے اور فاضلانہ انداز میں مغربی فلسفیوں کے متعلقہ نظریات کا محاکمہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ فلسفہ ان سوالات کے تسلی بخش اور مکمل جوابات پیش نہیں کر سکا۔ درمیان میں اسلامی روایت کے اندر انہوں نے تمام دیگر حکمائے

www.vabahu.com

اسلام کہ چھوڑ کر تصوف کا بالعموم اور متصوفانہ فلسفے کا بالخصوص ذکر بھی کیا ہے اور شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کے افکار و واردات کو اسی پرکار نظر سے دیکھاہے جو ان کے دور کے فلسفیوں کے ساتھ مخصوص تھی' انہوں نے بھی مسلمانوں کی سیاست و حکومت کے زوال کو نظریہ وحدت الوجود کے اقرار و تسلیم کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

آخر میں اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے انہوں نے فرمایا ہے کہ فلسفہ ان نظری و عملی سوالات کے جوابات دینے میں ناکام رہا ہے اور اس قول کے حوالے پر بیان ختم کیا ہے کہ اَلفَلسفَتہ وَالاِستَدلال لَا تَوصّل اَلحَقّ وَالھُدیٰ (فلسفہ و استدلال حق اور ہدایت تک نہیں پہنچاتے) (۳)

اگرچہ فلسفہ حق و صداقت کو جامع صورت میں نہیں دیکھ سکتا اور اپنے بلند بانگ دعاوی کے باوجود اپنے ہی اٹھائے ہوئے سوالوں کے تسلی بخش جوابات نہیں دے سکتا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ فلسفے کا ان مسائل کے حل میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسانی عقل ایک بہت بڑا عطیہ اِلٰہی ہے اور فلسفہ اسی عقل کے ذریعہ قابل غور امور کو ترتیب دیتا ہے اور کسی مسئلے کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے کسی صداقت یا قدر کے درجے کو متعین کرتا ہے اور پھر بنیادی مسائل کی وضاحت کرتا ہے۔

شیخ الاکبر ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ عقل میں حق و معرفت اور تاثر پذیری کی استعداد موجود ہے لہٰذا وہ "وجود حق تعالیٰ' توحید' معبودیت کے اجمالی تصورات" تک تو رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ وحی اور علم لدُنّی کے مدعی' نبی اور ولی بھی عام لوگوں کو اپنی عقل استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ عقل ان کی تعلیمات کو قبول کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتی ہے۔

علامہ جلال الدین افغانی نے اپنی ایک تقریر میں فلسفے کی اہمیت کا اقرار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ فلسفہ ہی ہے جو ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے لئے قابل فہم بناتا ہے۔ یہی انسانی عظمت کی وضاحت کرتا ہے اور انسان کو مناسب راستہ دکھاتا

ہے۔"(۴)

ویسے لغت میں عقل کے معنی باندھنے یا روکنے کے ہیں چنانچہ انسانی عقل بے لگام خواہشات کو ظلم سے باز رکھتی ہے' ناجائز طریقے سے تسکین یابی سے روکتی ہے' اخلاقی تزکیہ میں عقل کی مثبت کاروائی بڑی اہم ہے۔ ماضی کے واقعات' حال کے تجربات اور مستقبل کے متوقع نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے عقل حکمت و اخلاق کے کثیر اعمال میں صحیح حکم لگاتی ہے۔ صرف وہی احکام اس کی حدود سے باہر رہتے ہیں جن کے جائز و ناجائز ہونے کے بارے میں وحی رسالت و نبوت امتیازی یا خصوصی طور پر کوئی فیصلہ صادر کرتی ہے۔ تب وہ عقل کی حدود سے فائق قرار پاتا ہے۔

چنانچہ جب ہم تاریخ عالم میں بڑی تہذیبوں کے اندر ان کے مفکرین کی فکر و نظر کے ثمرات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اور اسکی پیدائش کے بارے میں کوئی حتمی بات کہی گئی ہو یا نہیں اور ان کے فلسفی کوئی جامع World View پیش کر سکے ہوں یا نہیں مگر فکر و نظر کی تاریخ میں دنیا کے اندر انسان اور اس کے ذہنی' اخلاقی اور کسی حد تک روحانی مسائل کی نہ صرف نشاندہی کی گئی ہے بلکہ ان کی درجہ وار اہمیت بھی واضح کی گئی ہے۔ ان مفکرین نے کم از کم اس دنیا میں انسانی مسائل کا جائزہ لینے کی پوری اور مخلصانہ کوشش کی اور سوجھ بوجھ کی ایسی باتیں کہہ گئے جو متعلقہ ادوار میں منزل کی طرف سفر میں گو ایک حد تک سہی' "چراغِ رہگذر" ضرور بنی رہیں۔

تمام قدیم مفکرین نے کائنات میں انسان کے مقام کو ہی اہمیت دی ہے اور کائنات کی پیدائش کے بارے میں ان کی آراء یا تو محض تمثیلی تھیں یا قیاس پر مبنی تھیں لیکن کائنات میں انسان کے مقام' کردار اور اس کے مقصد پر انہوں نے کھل کر اور مُدلّل انداز میں باتیں کی ہیں۔

سب سے قدیم تہذیب ہندوستان کی ہے۔ وہاں کے مفکرین نے نہ صرف خالق کائنات انسان' اس کے عمل اور اسکی منزل کے بارے میں قابل قدر نظریات

www.yabahu.com

پیش کئے ہیں بلکہ مقصد کو پانے کے لئے ذرائع کی بھی با تفصیل نشاندہی کی ہے۔

گو ہندو گروؤں کی دی ہوئی تعلیم بعد کی بت پرستی نے مسخ کر دی مگر پھر بھی اب تک ان کی کتب میں عقیدہ توحید اور خدائے واحد کی بندگی کی تعلیم موجود ہے۔ رگ وید میں فرد کو ایک مسافر کہا گیا ہے۔ مسافر کی ایک منزل ہوتی ہے۔ ہندو تہذیب میں انسان کا سفر مادی زندگی سے شروع ہوتا ہے اور آتما سے وصل پر ختم ہوتا ہے۔ اس تہذیب میں مرد کامل ایک روشن ضمیر عارف ہے جو ریاضت' مراقبات اور ترک دنیا کے ذریعہ یہ مقام پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی پاکیزگی بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ ایک ہندو پروفیسر نے لکھا ہے

"پس طالب کو محدود اور لامحدود' خود اور غیر خود کے فرق کو سمجھنا چاہئے اور اسے اس جہان کی نہیں بلکہ دوسرے جہان کی مسرتوں کی طمع کرنی چاہیے۔ یہ کام ہرگز آسان نہیں ہے بلکہ یہ قابلیت اخلاقی تربیت سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔"(۵)

تمام سِرّی مَسالک کی طرح ہندوؤں کی تعلیمات میں بھی انسان کی ساری مساعی کا رخ ظاہر سے باطن کی طرف ہے۔ اور تمام تعلیم' ثقافت اور معاشرتی کارگردگی کی جہت اسی طرزِ فکر و عمل کی روشنی میں متعین ہوتی ہے۔

بدھوں کے ہاں انسان کا مقصد اعلیٰ نروان کا حصول ہے جو ایک طرح کا ذہنی عمل ہے جو ضبط' توجہ اور خود احتسابی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

قدیم چینی تہذیب میں ایک روح عظیم کا تصور موجود ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ افراد انسانی کے لئے کنفیوشس نے ظاہری انتظام کار کی تدبیر پر زور دیا جبکہ تاؤمت کے فلسفے نے ظاہر کے کرب و اضطراب سے بچانے کے لئے باطنی سکون کے حصول کی تاکید کی۔ ان دونوں نظریات نے خارج و داخل میں ایک مہذب چینی کے عمل میں توازن پیدا کیا اور چونکہ اخلاق کے ذریعہ تقدیر کو مسخر کرنے پر زور دیا گیا' اس لئے ان کی تہذیب میں اعلیٰ اخلاق و ہمدردی کی خوبیاں اعلیٰ قرار پائیں۔ چینی تہذیب میں مردِ کامل ایک مرد دانا Sage ہے جو حیات و

کائنات کو درد مندی کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسی نظر سے دانائی اخذ کر کے ہمہ وقت اپنے لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتا ہے۔

یونانی تہذیب میں شاید وجدانی مسلک کی اشاعت و پیروی کا دور بھی گذرا ہو مگر بعد میں عقل و استدلال کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ افلاطون اور ارسطو اور دیگر یونانی اساتذہ کے ہاں خالق و معبود کا تصور موجود ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے ہاں انسانی کوششوں کا سارا مقصد یہ قرار پایا کہ فرد کا عمل و فعل معقول و مبنی بر حکمت ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کے ہاں مرد کامل کا نمونہ ایک حکیم ہے جو حکمت و استدلال سے مسائل حل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی طریق کی تعلیم دیتا ہے۔

سامی تہذیب میں موسوی شریعت کی پیروی کرنے کے نتیجے میں حاصل ہونے والی حکمت کو اولیت حاصل ہے جس میں انسان کو اس حد تک اہمیت دی گئی کہ کہا گیا' اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ رشتہ عبد و معبود میں خالق و مخلوق کی ایک گونہ یگانگت کو واضح کیا گیا۔ انسان کو خاک سے پیدا کیا گیا اور اس میں روح پھونکی گئی۔ لہٰذا اب تزکیہ اخلاق سے ہی روحانی صلاحیت کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اخلاق کی بنیاد وحی الٰہی مہیا کرے گی اور قابل قبول نمونہ دینداری کی زندگی ہو گی کیونکہ اسی طریق سے ہی اللہ کے قُرب میں جگہ مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ موسوی مسلک میں انسان کا کمال حصولِ قُربِ الٰہی ہے۔ ان کے نزدیک مردِ کامل وہ ٹھہرا جو مُقرّبِ خُدا ہے۔

اندریں بارہ یہ بات قابل غور ہے کہ ہر تہذیب کے فلسفیوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے کافی حد تک استفادہ کیا کیونکہ تہذیبیں در اصل دینی روایت کی پیدا کردہ اصل یا مسخ شدہ ثقافت کا مظہر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہ تھیں۔ ہماری ایمانی روایت کے مطابق انبیاء کی تعلیم وہی تھی جسے بعد میں پیغمبر اسلام ﷺ نے ظاہری و باطنی لحاظ سے مکمل طور پر اس طرح پیش کیا کہ اب اس میں کچھ اضافہ و ترمیم کی گنجائش ہی نہ رہی بلکہ نبوت کے منصب کو ہی

www.yabahu.com

ختم کر دیا گیا چنانچہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کے حوالے بیکار ہو گئے۔ اب دین و مذہب کی بات ہو سکتی ہے تو صرف اسلام کے حوالے سے ہی کی جا سکتی ہے کیونکہ فیصلہ ہو گیا کہ

"دِین جو ہے اللہ کے ہاں' سو یہی مُسلمانی حکم برداری"(۶)

دین پہلے بھی اسلام تھا اور اب بھی اسلام ہے۔ لہٰذا دین کی تعلیم وہی صحیح و کامل ہے جو حضرت مُحمّد مُصطفیٰ ﷺ پر نازل شدہ مصحف میں اپنی اسی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے جیسے وہ نزول کے وقت تھی۔

گو کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا "اور اسی نے تم کو واضح کتاب بھیجی"(۷)

لیکن یہ وضاحت یا تفصیل روحانی ہدایت سے متعلق ہے کیونکہ یہ هُدىً لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے یعنی ان لوگوں کے لئے رہنما ہے جو گہرا دینی شعور رکھتے ہوں اور ایک لائحہ عمل کے تحت زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں۔ قرآن نہ سائنس کی کتاب ہے نہ فلسفہ کا طومار۔ اسی طرح یہ تاریخی حقائق و واقعات کا تذکرہ ہے نہ عمرانی علوم کی انسائیکلوپیڈیا۔ مگر یہ معجزہ ہے کہ ہر شعبہ علم سے وابستہ آدمی اس سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور اپنے علم کی روشنی میں اس کے مطالعہ کو اپنے لئے مفید بھی پا سکتا ہے۔ یہ قرآن کا نمایاں اعجاز ہے اور ایک ہمہ دان ہستی کا کلام ہونے کی بین دلیل۔

قرآن مجید میں کائنات کی پیدائش کا ذکر بھی ہے مگر سائنس کی کتاب کی طرح نہیں۔ بس اشارات موجود ہیں۔ ان سب کو ترتیب بھی دیا جائے تو پیدائش کے سلسلہ میں کئی مرحلے ہماری معلومات سے باہر رہ جاتے ہیں۔ بہر حال ان کے مطالعہ سے ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید سائنس کے مسلمہ بنیادی نظریات بھی اس کے مئوید ہیں اور اگر کہیں خلاف نظر آئیں ' تب بھی اس کی صداقت پہ کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ سائنس کے نظریات ہمیشہ مشتبہ اور مائل بہ تبدل رہے ہیں۔

قرآن کی تعلیم اللہ پر ایمان سے شروع ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود اور وقوع پر بلا تحسین کیفیت ایمان لے آنا چاہیے۔(۸) اور یہ مان لینا چاہیے کہ ہر شے کو اسی نے پیدا کیا۔

"اور اُس نے ہر چیز بنائی"(۹)

اللہ نے یہ تمام کائنات چھ اَدوار میں خلق کی:

"یہ اللہ ہے جس نے آسمان و زمین اور جو ان کے بیچ ہے' چھ دن میں بنائے"(۱۰)

ایک ایک یَوم یا دور کئی ہزار یا لاکھوں سال کا بھی ہو سکتا ہے۔

یہ اس کے حکم سے وجود میں آئی

" اس کا حکم یہی ہے۔ جب چاہے کسی چیز کو کہ ہو' وہ ہو جائے" (۱۱)

جیسا کہ سائنس دانوں کا بھی خیال ہے کبھی یہ سب کچھ دھواں دھواں تھا۔

"پھر چڑھا آسمان کو اور وہ دھواں ہو رہا تھا" (۱۲)

پھر جب اس کا خاتمہ ہو گا' تب بھی یہ دھواں دھواں بن کے رہ جائے گا

"سو تو راہ دیکھ جس دن کہ لاوے آسمان دھواں صریح" (۱۳)

ایک دور شاید ایسا بھی گذرا جب کائنات کے اجزاء مِلے جُلے تھے' الگ الگ کرے اور کہکشائیں نہیں بنی تھیں۔ پھر وہ علیٰحدہ ہوئیں اور ان کا ہر نظام اپنے حساب سے کام کرنے لگا۔

"اور کیا ان منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھولا" (۱۴)

بعد ازاں ہمارے کرہ ارض پر یا دوسرے کروں میں بھی پانیوں کی شکل ظاہر ہوئی:

"اور اس کا تخت پانی پر تھا" (۱۵)

پانی سے حیات نمودار ہوئی:

"اور ہم نے ہر چیز جس میں جی ہے' پانی سے بنائی" (۱۶)

بتدریج ایک خاص ماحول نے ترکیب پائی تو انسانی جسم کا پیدائش ہوئی:

"آدمی بنایا کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا" (۱۷)

پھر اس میں اللہ نے اپنی روح پھونکی۔

"اور پھونک دوں اس میں اپنی روح سے" (۱۸)

www.yabahu.com

اس طرح انسان جسم اور روح کا مرکب بن کر ظاہر ہوا تو اللہ نے اپنی تمام مخلوقات میں بنی نوع انسان کو بزرگی عطا کی

"اور ہم نے عزت دی آدم کی اولاد کو" (۱۹)

انسان کو اپنا نائب یا خلیفہ ہونے کا شرف عطا کیا اور اگر ایسے اسباب پیدا نہ ہوں کہ خدانخواستہ کسی کی فطرت مسخ ہو کر رہ جائے تو بنی نوع انسان کا ہر فرد اس کا خلیفہ بننے کا اہل قرار پایا۔

"اور اس نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں" (۲۰)

کائنات کی پیدائش سے پہلے الٰہی ارادے کے اندر انسان کی پیدائش اور اسکی خلافت و تکریم ضرور مقدر تھی اور یہ طے تھا کہ اس کائنات کا مرکزی کردار انسان ہو گا اور تمام مادی و روحانی قوتیں اس کے سامنے سرنگوں ہوں گی:

"اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ مجھ کو زمین میں ایک نائب بنانا ہے" (۲۱)

انسان کو اپنے منصب کا شعور ملا تو اللہ کے حکم سے تمام روحانی قوتوں نے اس کے سامنے اطاعت اختیار کر لی:

"اور جب ہم نے فرشتوں کا کہا سجدہ کرو آدم کو، تو وہ سجدہ کر پڑے مگر ابلیس نے قبول نہ رکھا" (۲۲)

ہر شئے انسان کے لئے مُسخّر کر دی گئی:

"اور اس کی طرف سے تمہارے کام پر لگائے جو کچھ ہیں آسمانوں میں اور زمین میں سب" (۲۳)

وہ بات جو سائنس اور فلسفہ واضح نہ کر سکے۔ دینی تعلیم میں واضح کر دی گئی۔ یعنی یہ کائنات اللہ نے پیدا کی اور اس کو سنبھالنے والا بھی وہی ہے۔

"تحقیق اللہ تھام رہا ہے آسمانوں کو اور زمین کو کہ ٹل نہ جاویں" (۲۴)

" اور ہم نے بنائی ہیں تمہارے اوپر سات راہیں اور ہم نہیں ہیں خلق سے بے خبر" (۲۸)

"اسی کے پاس کُنجیاں ہیں آسمانوں کی اور زمین کی" (۲۶)

"اور اسی کے پاس کُنجیاں ہیں غیب کی ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا" (۲۷)

وہی یہ نظام کائنات چلانے کی تدبیر کرتا ہے اور رشد و ہدایت کے احکام بھی نازل کرتا ہے کہ سب اس کی تدبیر کے عین مطابق چلتے رہیں اور بالآخر اپنے رب سے ملنے پر یقین رکھیں:

" تدبیر کرتا ہے کام کی، کھولتا ہے نشانیاں، شاید تم اپنے ربّ سے ملنا یقین کرو" (۲۸)

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ بعض طاقتیں سرکشی کی طرف مائل ہوئیں تو ان کو اس کی اجازت دی گئی کیونکہ وہ بھی انسان کے ذہنی، اخلاقی و روحانی ارتقاء کے لئے ضروری تھیں جیسے شیطان۔ اس طرح گویا وہ بھی الٰہی حکم کی مصلحت سے باہر نہ رہیں۔ قرآن مجید کا نکتہ نظر اس بارے میں واضح ہے شر ہو یا خیر، حسنات ہوں یا سیئات، انسان کے لئے یہ سب ان معنوں میں آزمائش ہیں کہ وہ ان سب میں ملوث ہو کر یا ان کی کشمکش سے دوچار ہو کر اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لاتا ہے اور امتحان کے بعد اپنی تکمیل کے مدارج طے کرتا ہے:

"ہم جانچتے ہیں بُرائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو اور ہماری طرف پھر آؤ گے" (۲۹)

" اور آزمایا ان کو خوبیوں اور برائیوں میں، شاید وہ پھر آویں" (۳۰)

دِین (اِسلام) میں بھی قرآنی تعلیمات کی رو سے انسان کو ہی کائنات کا مرکز ٹھہرایا گیا ہے۔ گویا ایک فعال اور با مقصد کارکن وہی ہے۔ اور الٰہی صفات نے اپنے ظہور و اظہار کے لئے اسی کو چنا ہے۔

اب یہ دیکھنا ضروری ہو گیا کہ اگر انسان ہی خلیفہ اور نائب حق ہے تو انسانی فطرت کیا ہے۔ کیا اسے ایسی ہی فطرت بھی ودیعت کی گئی ہے کہ اسے حق اور اس کے عمل کو بر حق کہا جا سکے۔

www.yabahu.com

بعض نے کہا کہ انسان پیدا ہوتا ہے تو ایک سادہ کاغذ کی مانند ہوتا ہے یعنی فطرت کے لحاظ سے نہ وہ نیک ہے نہ بد' بعد میں ماحول اور تعلیم کے مطابق نیک بن جاتا ہے یا پھر دوسروں نے کہا کہ وہ فطری طور پر برا ہے' بعد میں اس کی تہذیب ہوتی ہے تو اچھا بن جاتا ہے۔ پھر کچھ ایسے تھے جنھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ انسان خیر و شر کا مرکب ہے۔ نیکی کا ماحول ملے تو نیک بن جائے گا اور بدی میں پڑ جائے تو بد ہو گا۔ لیکن قرآن مجید میں تعلیم دی گئی کہ انسان اپنی پیدائش کے ساتھ فطرت صالح لے کر آتا ہے۔ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی فطرت صالح کا مرکزی نقطہ قلب سلیم ہے:

"ہم نے آدمی خوب سے خوب اندازے پر بنایا" (۳۱)

(ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا) (۳۲)

باقی آیات کریمہ کی تفسیر اسی اصول کی روشنی میں کرنی ہوگی مثلاً:

"پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ کر چلنے کی" (۳۳)

"اور اس کو دو گھاٹیاں سوجھا دیں" (۳۴)

اس ضمن میں متعلقہ احادیث مبارکہ کا مطلب بھی یہی ہے۔

"دنیا میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اصل فطرت پر' پھر یہودی اسے یہودی بنا لیتے ہیں اور نصرانی"

یا "جس قدر بچے پیدا ہوتے ہیں۔ سب ملّتِ اسلام پر پیدا ہوتے ہیں"۔

اول الذکر حدیث سے ظاہر ہے کہ انسان اگر گمراہ ہوتا ہے تو خارجی عوامل کی بناء پر ورنہ اللہ نے اسے جس فطرت پر پیدا کیا ہے' وہ تو آلائش سے پاک ہے۔

انسان کی فطرت اصلی کے متعلق صحیح عقیدہ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ آگے مقصد اور اس کی تکمیل' شخصیت و کردار کی تعمیر و تشکیل اور روحانی ارتقاء وغیرہ کے بارے میں اسی کی روشنی میں لائحہ عمل مرتب ہوتا ہے۔

"..... انسان کا اپنی فطرت صلوقہ سے بے خبر رہنا دراصل اس کی تمام ناکامیوں کا جڑ ہے۔ کائنات عالم کے دائرہ حقیقت کے لئے اس کا وجود بمنزلہ ایک

نقطہ و مرکز کے ہے۔ پس جب تک انسان اپنے نفس کی حقیقت کو نہیں پائے گا۔ وہ تمام عالم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا اور حقیقت کو نہیں پا سکتا تو اپنی تخلیق کی غرض و مقصد کو بھی پورا نہیں کر سکتا" (۳۵)

انسان دنیا میں اس لئے خیر و شر اور موت وحیات کی کشمکش کے درمیان کھڑا کر دیا گیا ہے کہ ان حالتوں اور قوتوں کے درمیان رہ کر وہ اپنی ذات کو ظہور میں لائے۔ یعنی اپنی فطری استعداد کے مطابق اپنے مقصد کو پا لے۔ مقصد کے بارے میں قرآن میں فرمایا۔

"اور میں نے جو بنائے ہیں جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو" (۳۶)

گھو بندگی اور عبادت کس لئے؟ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو پالے اور اپنی فطرت و ذات کو ظہور میں لائے۔ یہ یافت و ظہور عبادت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ انسان کو عقل و خرد اور کشف و وجدان کی صلاحیتیں اسی لئے دی گئیں کہ وہ امتحان (جانچ یا آزمائش) سے گذر کر اس روحانی مقام پر پہنچ جائے جہاں سے آگے آخرت کا عالم شروع ہوتا ہے۔

"جس نے بنایا مرنا اور جینا کہ تم کو جانچے' کون تم میں اچھا کام کرتا ہے۔" (۳۷)

حیات و موت دونوں کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ نیستی سے ہستی وجود میں آئی اور جسے ہم موت کہتے ہیں' اس سے ہستی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ صرف ایک اور جہان میں زندگی داخل ہو جائے گی۔

" اللہ ہی خلق کی ابتداء کرتا ہے' پھر اس کا اعادہ کرتا ہے۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے" (۳۸)

موت کے بعد انسان کا معاملہ پھر براہ راست اللہ کی طرف لوٹ جائے گا اور وہاں جن حالات میں اسے رکھا جائے گا' وہ جنت اور جہنم ہیں۔ بعض کے نزدیک جہنم ایک وقت تک ہے' جنت ہی اصل ٹھکانا ہے۔ گویا موت کا خوف اگرچہ بہت بڑا نظر آتا ہے لیکن در حقیقت محض ایک وسوسہ ہے جو صرف دنیا تک نظر کو

www.yabahu.com

محدود کرنے سے وجود میں آتا ہے اور قلب و نظر کو آفتوں سے دو چار کئے رکھتا ہے۔

دین میں حکیمانہ مسلک کے نمائندوں یعنی صوفیاء کرام نے حیات و کائنات کی پیدائش اور اندریں بارہ الٰہی مقصد کے متعلق کچھ احادیث بار بار دہرائی ہیں تاکہ بنیادی عقیدہ کا داخلی پہلو بھی واضح ہو جائے۔

حدیث قدسی ہے۔

"میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ بس میں نے چاہا کہ مَیں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا"

اللہ کے "چاہنے" کو انہوں نے جذبۂ عشق کہا ہے یعنی عشق کا جذبہ تخلیق یا ظہور کا سبب بنا۔

سُلطان العارفین سُلطان باھُو رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے الہامی کلام میں فرمایا۔

"حضرت عشق نے کہ جس کی ذات حقیقت ہاھُوِیّت کی آنکھوں کا سَرچشمہ ہے، دونوں جہان کے اوپر بارگاہِ کبریا میں تختِ سلطنت آراستہ کیا۔ اس کی پاک ذات کی ماہیت کے کمال عبرت سے عقل کے ہزاروں ہزار بے شمار قافلے سنگسار ہو گئے۔ سُبحان اللہ! خاکی عناصر کے اجسام سے، اپنی کامل قدرتوں کے آثارِ جمال و جلال کے ظہور کے لئے ہزاروں مظاہر کو آئینۂ با صفا بنائے اپنے رُوئے زیبا کا مظاہرہ کر رہا ہے"(۳۹)

یہ پوری کائنات اس کے حُسن کا آئینہ ہے جس کی اصل حُسن و خیر ہے۔ شر ایک اضافی امر ہے۔ اسی پر انسانی فطرت کو قیاس کر لیجئے:

"سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے"۔(۴۰)

اسی طرح اس روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے: "بے شک اللہ نے آدم کو صورت رحمٰن پر پیدا کیا" یعنی انسان کا ظاہر و باطن اس کی رحمت کا مظہر ہے۔ اسی لئے اس کا قلب پاکیزہ ہو کر گویا رحمٰن کا عرش بن جاتا ہے۔ فرمایا "انسان میرا بھید ہے اور میں اس کا بھید ہوں"

جب تک انسان اس جہان میں ہے، اس کی فطرت صالحہ اپنی ذات کا ظہور چاہتی ہے چنانچہ اس کے لئے ہدایت بھی اللہ نے اپنے ذمہ لے لی۔ نبی اور رسول بھیجے، اور اوامر و نواہی کے بارے میں احکام نازل کئے اور ذکر و عبادت کے طریقے سکھائے تاکہ ان کے ذریعے انسان اپنے مقصود کو پا لے۔

قرآن کی روشنی میں اسلام پر ایمان ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا متقاضی ہے جس میں سب لوگ اللہ کے بندے بن کر رہتے ہوں اور جہاں احکام الٰہی کی پابندی اور تعمیل کی جا رہی ہو۔

ظاہر ہے کہ جو آدمی ایسے معاشرے میں ہوش سنبھالے گا اس کے لئے آسانی ہوگی۔ جیسے دوسرے عبادت کر رہے ہوں گے، وہ بھی ویسا کرے گا۔ جیسے دوسرے معاملات نبٹا رہے ہوں گے، وہ بھی انہی کی طرح کرنا شروع کر دے گا۔ اگر معاشرے میں کچھ کوتاہیاں بھی ہوں گی تو اس کے سامنے تعلیم شریعت موجود ہوگی وہ کسی محتاجی کے بغیر خود سیدھا راستہ اختیار کر سکے گا۔

وہ ایمان کے اصول سیکھے گا اور اس کا عقیدہ اللہ کے دوسرے مطیع بندوں کی طرح ہوگا۔ یعنی

اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین ﷺ پر ایمان

آسمانی کتابوں اور فرشتوں پر ایمان

قیامت اور آخرت پر ایمان

اس ماحول میں عبادت کے طور طریق وہی ہوں گے جو اللہ کے آخری رسول ﷺ نے سکھائے۔

۱۔ توحید: سب سے پہلے درستی عقیدہ ۔ ظاہر و باطن میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا اقرار

۲۔ نماز۔ پانچ وقت

۳۔ روزہ۔ سال میں ایک ماہ ۔ رمضان میں

www.yabahu.com

۴۔ حج ۔ جب فرض ہو تو کم از کم عمر میں ایک بار
۵۔ زکوٰۃ۔ نصاب کے مطابق ہر سال صدقات کی ادائیگی
۶۔ تلاوت قرآن' مسنون دعائیں' درود و سلام وغیرہ

پہلے تو یہ سب کچھ سیکھنا اور کرنا پڑے گا مگر بعد ازاں توفیق سے کسی مردِ خُدا کی صُحبت میسر آ گئی تو باطنی جہات کُھلنی شروع ہو جائیں گی۔ ان عبادات میں ذوق و شوق اور انہماک سے حسن عمل بڑھتا جائے گا حتیٰ کہ مقدر میں ہوا تو حلقہ درویشاں میں پہنچ کر جب عمل پیرا ہو گا تو ان کی بجا آوری میں سر تاپا خلوص بن جائے گا۔ تب اس اخلاص کا نتیجہ کشف و مشاہدہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو ایمان و یقین اور اعمال صالح کی آخری منزل ہے۔

اتنا کچھ بھی اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ دین (اسلام) میں اخلاقی تربیت پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ ایک حدیث کے مطابق گویا پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کی غرض بھی یہی تھی۔ اچھے اخلاق سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔ حقوق العباد کی پابندی کی جاتی ہے۔ انسانی رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ خوش اخلاقی امن و مسرت کی ضامن بنتی ہے اور نتیجہ" لوگ سکھ چین سے زندگی بسر کرتے ہیں مگر یہاں بھی اخلاق کو وحی رسالت کے تابع کر دیا گیا۔ اچھا وہی ہو گا جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ اچھا کہیں اور برا وہی ہو گا جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ برا کہیں

اسلام میں اخلاق کی تعلیم اس قدر تفصیل اور منظم طریقے پر دی گئی ہے کہ شاید اس سے باہر کہیں اور ڈھونڈیں بھی تو ہرگز نہ ملے گی۔ حتیٰ کہ اخلاقی تربیت کے مراحل تک کی نشاندہی کر دی گئی

پہلا مرحلہ:

جب انسان کی خواہشات بے لگام ہوتی ہیں اور ضروری ہوتا ہے کہ وہ خارجی قوانین اور داخلی ضبط کے ذریعہ ان پر قابو پاتا ہے۔

دُوسرا مرحلہ:

جب انسان کے اندر ضبط قوی ہو جاتا ہے اور خود اندر سے ایک قوت اچھائی اور برائی میں تمیز کر کے راہ عمل سجھانے لگتی ہے۔ عرف عام میں اسے ضمیر کہتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ:

جب وہ نیکی اور خیر میں راسخ ہو جاتا ہے اور اطمینان کے ساتھ نیک کاموں میں لگ جاتا ہے۔

قرآن کے الفاظ میں ان مراحل کو نفسِ امّارہ ' نفسِ لوّامہ اور نفسِ مُطمئنہ کہا گیا ہے۔

ایمان و عمل کے اس سلسلے میں معاشرے میں بندے کے سامنے ایک لائحہ عمل تو موجود ہوگا ہی' وہ اگر چاہے تو فقہائے دین میں سے کسی کو اپنا استاد یا رہنما مان کر اپنے عقائد و اعمال کو درست کر سکتا ہے یا انہیں سنوار سکتا ہے۔

جو بندہ یوں مانے اور سوچے گا اور یوں عمل پیرا ہو گا' وہ اللہ کا ایک اچھا اور فرمانبردار بندہ ہو گا۔

اب آگے ایک اور دائرہ شروع ہوتا ہے جو ایک فرمانبردار بندے کی ترقیات سے متعلق ہے۔ یہ وہ دائرہ ہے جہاں تمام روایات و ہدایات پیغمبر اسلام ﷺ کے باطنی جمال سے مستیز ہو رہی ہیں' جہاں دین کی سری حکمت نے عرش و فرش کو اپنے اندر سمو لیا ہے اور جہاں دینی معرفت اس مقام تک جا پہنچتی ہے کہ آگے نہ عقل کی رسائی ہے نہ وجدان کی۔ اس دائرے کو تصوف یا طریقت کہتے ہیں۔

یہ دائرہ روحانی کردار و شخصیت کی تکمیل کا دائرہ ہی نہیں بلکہ ذہنی و روحانی کج روی کی اصلاح بھی یہیں ہوتی ہے۔ پہلے اس کی سیرت کی تکمیل کا معیار معاشرے نے مقرر کیا تھا' یعنی معاشرے کو اس سے یہ توقع تھی کہ وہ ایک اچھا بندہ اور نیک مسلمان بن کر رہے۔ جب اس معیار پر وہ پورا اترا تو اب ایک اور

www.yabahu.com

منزل سامنے آ گئی۔ اب اسکی تکمیل کا معیار وہ ہو گا جو دینی شعور ہر قسم کی ظاہری و باطنی استعداد بروئے کار لانے کے نتیجے میں متعین کرتا ہے۔

در اصل شریعت پر عمل کرنے سے انسان کے اندر ایک خوابیدہ سا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ میری منزل محض قاعدے قانون کی پابندی تک محدود نہیں۔ اب وہ شریعت میں راسخ ہو گیا تو وہ اس سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اپنی فطرت کے ظہور کی تمنا رکھتا ہے' اپنی ذات کی تکمیل چاہتا ہے یا یوں کہئے کہ وہ اس سے اگلی فضا میں پرواز کے لئے قدرتی طور پر ایک رہبر کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی ایسا ہو جو اسکی کوتاہیوں کی نشاندہی کرے۔ انہیں دور کرنے میں مدد کرے اور روحانی پرواز میں ممد ثابت ہو۔ ایسا رہبر صرف طریقت کے مقام پر ہی مل سکتا ہے۔ اگر کسی کو خیال ہو کہ وہ صرف کتابیں پڑھ کر صوفیوں سے کہہ سن کر اور از خود اوراد و وظائف سے کچھ حاصل کر لے گا اور کچھ بن جائے گا تو اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس علم (تصوف) کا حصول بھی دیگر علوم کی طرح نظم و ضبط اور تربیت و تکمیل سے مشروط ہے جو صرف کسی استاد کی نگرانی' رہبری اور مخصوص موافق ماحول میں ہی ممکن ہے۔

بعض لوگ طریقت کو شریعت کا ہی زائد حصہ قرار دیتے ہیں مگر اس موضوع کو اگر الگ عنوان کے ساتھ ہی بیان کیا جائے تو درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور مقامات و مدارج سمجھنے میں سہولت ہو گی۔ گو اس درجے پر یہ عنوان (طریقت) بعد میں قائم کیا گیا مگر خود دینی روایت میں شروع سے عمل کی اس بلند تر سطح کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔

مشہور حدیث ہے۔ حضرت عُمر بن خطاب نے روایت' کی کہ "..... جبرائیل نے کہا مجھے احسان کے متعلق بتایئے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے....."

جسے رسول اللہ ﷺ نے درجہ احسان کہا' اس کی ابتداء کو بعد میں طریقت کہا جانے لگا۔

جس طرح شریعت میں فقہ کا عالم امامت کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ اسی طرح طریقت میں صوفی مرشد صاحب امر بن کر مرکزی کردار کا حامل ہوتا ہے جو اپنے حلقے میں فقہ کے امام سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

جہاں ایک فقیہ قانون کی پابندی اور سختی پر زور دیتا ہے' وہاں صوفی مرشد اپنے حلقہ تعلیم و تربیت میں ایسے لوگوں کے لئے بھی گنجائش پیدا کر لیتا ہے جو کمزور ہیں یا کجرو ہیں اور ان کی طبیعت فساد کی طرف مائل ہے۔ صوفی مرشد کو اگر بروں کے گھر تک بھی جانا پڑے تو وہ چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی مقصد برآری کے لئے لہو و لعب کے اڈوں پر جانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔ بروں کی اصلاح کے لئے' ان کو نیکی کی طرف مائل کرنے کے لئے اور ان کو بری صحبت یا ماحول سے نکالنے کے لئے وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر اسے بانسری بجانی پڑے' بہروپ بدلنا پڑے' اجنبی راہوں پر چلنا پڑے تو وہ ایسا کر گذرتا ہے۔ اس کے اندر خلق خدا کی محبت اور ہمدردی اور ان کے لئے خدمت کا جذبہ اس قدر موجزن ہوتا ہے کہ فقیہ معاشرے میں اصلاح احوال کی کوشش میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے اور صوفی آگے بڑھ کر اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ صوفیائے کرام نے معاشرے کے بگڑے ہوئے لوگوں کو درست کیا' سنوارا اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھتے ہوئے ان کو راہ راست پر لے آئے۔

اسی طرح باہر سے آنے والے کچھ مائل بہ اسلام ہوتے ہیں یا نو مسلم ہوتے ہیں جو ابھی اسلام کے نزدیک ہی پہنچ پائے ہیں اور ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لئے نرمی اور خاص قسم کی بصیرت اور حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صُوفیوں نے اُن کے لئے گنجائش پیدا کیں۔ تمام طریقے آزما ڈالے۔ یہ قوالیاں' مخصوص قسم کی مجالس اور تقریبات اسی طرح شروع ہوئیں کہ یہ لوگ نفسیاتی خلا سے اکتا کر کہیں اپنی پہلی حالت پر نہ لوٹ جائیں۔ اب خواہ لوگ کچھ

www.yabahu.com

کہیں مگر ان کا مقصود صرف یہی تھا کہ صُوفیاء نے غیر مُسلموں کی نبض پہچانی اور اس کے مطابق دوا وارُو پلا کر دین اسلام کی صحت مند فضا میں لے آئے اور پھر ان کی آئندہ نسلیں خود بخود سُدھر گئیں اور فقہا بھی اس قابل ہوئے کہ ان کو اسلامی شعائر سکھائیں اور انہیں فقہ و حدیث کی صحیح تعلیم دے سکیں۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ تصوّف' اِسلام اور غیر مُسلموں کے درمیان ایک پُل کا کام دیتا ہے۔ گذشتہ چودہ سو سال میں اسی پُل کو پار کر کے غیر مُسلم اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں اور اب تک ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں حکمران' فاتح اور فقیہ لوگوں کو اِسلام کی طرف نہ لا سکے' وہاں صُوفی مُبلغین اِس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

معاشرے میں عورتیں بھی رہتی ہیں جن کو رُوحانی معاملات میں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جبکہ دین میں ان کو مردوں کے ساتھ ساتھ درجات کی بشارت دی گئی ہے۔ البتہ ان کی تعلیم و تربیت اور روحانی سلوک کی نہج مختلف ہونی چاہیے۔ اس لئے ان کا دائرہ کار' ماحول اور میلان و رجحان مختلف ہوتا ہے۔ دینی پیشوا ان کی نفسیات اور ضروریات کا اکثر خیال نہیں کرتے لہٰذا یہ کام بھی صوفیاء نے کیا کہ انہوں نے خواتین کو اپنے دائرے میں رہنے کی تنبیہہ کرتے ہوئے ان کے لئے روحانی ترقی کی راہیں کھو لیں۔ ان کو احساس کمتری سے نکال کر اذکار کی تلقین کی' عبادت پر لگایا اور دلاسے کے ساتھ ساتھ ان کی ڈھارس بندھائی کہ وہ گھر میں رہ کر بھی بہت بڑا کام سر انجام دے رہی ہیں اور روحانی ترقی میں وہ مردوں سے پیچھے نہیں رہتیں۔

ظاہر ہے کہ صُوفی مُرشد کا منصب اپنی روحانی کوائف رکھنے کے ساتھ عِلم نفسیات اور نگاہِ بصیرت کا بھی متقاضی ہے۔

طریقت میں ایک مخصوص مُرشد کی رہنمائی اس لئے ضروری ہے کہ طالب حق کی روحانی تعلیم و تربیت کے لئے انفرادی اہلیت و خصوصیت اور استعداد و قابلیت کے ساتھ ساتھ اس کا پورا معاشرتی' ثقافتی پس منظر سامنے رکھنا ضروری ہوتا

ہے۔ اس کے لئے ایک خاص لائحہ عمل مرتب کیا جاتا ہے اور اس کے مطابق اسے راستے پر چلایا جاتا ہے۔ یہ کام کوئی پہنچا ہوا صوفی بزرگ ہی سر انجام دے سکتا ہے جسے مرشد کہتے ہیں۔ گو مشائخ طریقت نے اپنے اپنے دور میں نصاب بھی ترتیب دیئے مگر وہ بھی کسی ملک یا علاقے کے لوگوں کے نسلی رجحانات اور ان کی مخصوص نفسیات کے مطابق مرتب کئے گئے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق مشائخ ان میں ترمیم و اضافہ کرتے رہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی طریقہ میں مرشد کے بدل جانے سے تعلیم کا رنگ ڈھنگ بدلتا رہتا تھا۔

ایک طریق پر کچھ عرصہ چلنے کے بعد وہ حس بیدار ہوتی ہے جو علم و عمل کی اقدار صحیح طور پر جان سکتی ہے۔ وہ ہر شے' ہر واقعہ اور صورت حال کو دیکھ سکتی ہے جیسی کہ وہ اصل میں ہوتی ہے۔ مرشد کشف والہام کے ذریعہ طالب حق کی واردات اور رؤیاء کو سن کر جان لیتا ہے کہ اب طالب حق طریقت کے اس مقام پر آ گیا ہے جہاں اسے اگلی سطح پر لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ سطح حقیقت کہلاتی ہے۔

حقیقت کی سطح پر وہ اس احساس کے تحت عمل پیرا ہوتا ہے جو اسے ہر شے' ہر فرد اور ہر علم کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے حتیٰ کہ حیات و موت اور حق و باطل کی اصلیت اس کے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔ اس رُتبے کے لیے یہ دُعا سکھائی جاتی ہے۔ "الٰہی! دِکھا ہمیں حقّ کو حقّ اور ہم کو اس کے اتباع کی توفیق دے اور دکھا ہمیں باطل کو باطل اور توفیق دے ہمیں باطل سے بچنے کی' الٰہی! دکھا ہمیں حقیقتیں اشیاء کی جیسا کہ وہ ہیں" (۴۱)

مقام حقیقت تک پہنچا ہوا طالب اگر کامل ہو جائے تو وہ مرشد بن سکتا ہے یعنی وہ ایسا کرے یا نہ کرے مگر وہ دوسروں کو طریقت پر چلانے کے قابل ضرور ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد کو عام طور پر مشائخ متقدمین اپنا خلیفہ مجاز بنا دیتے تھے۔ ایسا خلیفہ ابتدائی درجے پر طریقت میں آنے والوں کو مرشد کی غیر حاضری میں کچھ وقت کے لئے رہنمائی فراہم کر سکتا تھا۔ لیکن وہ مطلق خلیفہ اس وقت بنتا تھا جب وہ

www.yabahu.com

اگلے ورجے یعنی معرفت میں بھی کا ملیت کا درجہ پا لیتا تھا۔

معرفت وہ مقام ہے جہاں سے آگے علم اور شعور روحانی کے بے شمار عوالم ہیں اور ان کی کوئی حد نہیں۔ بڑے مشائخ کے سامنے اہل تصوف کی جانچ کا ذریعہ یہی معرفت ہوتی ہے اور اسی معیار کو سامنے رکھ کر وہ کسی کی فضیلت و بزرگی کے قائل ہوتے ہیں۔

معرفت میں طالب حق کو پہچان کی وہ قوت ملتی ہے جو یقین و ایمان سے لے کر قضا و قدر تک کی کارکردگی کی خبر رکھتی ہے۔ معرفت میں وہ حق کو دیکھتا ہے' حق کو پہچانتا ہے اور حق سوچتا ہے۔ اگر وہ مرشد ہو تو وہ حق سکھاتا ہے' حق پر چلاتا ہے اور حق تک پہنچا دیتا ہے۔

حیات و کائنات کی پیدائش کی حقیقت اس پر کھل چکی ہوتی ہے۔ اس پیدائش کے مقاصد اور کائنات میں دوسری مخلوق پر انسان کی برتری کی معرفت سے وہ آگاہ ہوتا ہے۔ کائنات میں اسے اپنے مقام کا علم ہوتا ہے اور اپنے اس علم سے وہ دوسروں کو بھی بہرہ ور کرتا ہے۔ سعید وہ ہوتا ہے جو فلاح پا چکا ہو' کہ اس کا وجود کائنات میں مجسم خیر ہو۔ اسے وہ طمانیت حاصل ہو جو روحانیت میں کمال تک پہنچ چکا ہو۔ اب وہ "خیر" میں اس قدر راسخ ہو چکا ہو جسے اضطراب کی لہریں درہم برہم نہ کر سکیں۔ اس کا قلب' اس انبساط کی کیفیت سے مملو ہو جو کار خیر اور عبادت الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اب وہ دنیا میں رہتا ہے مگر دنیا کے نشیب و فراز اسے حق سے ہٹا نہیں سکتے۔ وہ دنیا کے کاروبار میں لگا ہوتا ہے' اسے اس میں فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ اس کا دل ہر حال میں مطمئن رہتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے اس دریا میں لہریں تو اٹھ سکتی ہیں اور شاید انہیں لوگ دیکھیں بھی مگر اس کی گہرائی میں ہمیشہ سکون رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ حق کو پہچان چکا ہے' اس نے ہر طرح سے کھوٹے کھرے کو پرکھ لیا ہے۔ انسانیت کا گوہر اس کے اندر تکمیل پا چکا ہے' روحانی اسرار اس پر پے در پے منکشف ہو رہے ہیں کہ وہ ہر آن اپنے تئیں عالم نو میں پاتا ہے۔ اس عالم نو میں موت و حیات الگ الگ جہانوں میں بٹی ہوئی

حالتیں نظر نہیں آتیں بلکہ اب جو زبان اس کے سامنے کھلتا ہے تو اس میں حیات ہی حیات ہوتی ہے۔ موت کا نشان اگر ملتا ہے تو محض ایک ہنگامی وقفے کے طور پر ورنہ ہر دم تازہ واردات کے سامنے کسی خوف و خطر اور خدشات و وسواس کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

اب اس کا مطمح نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہے مگر اس میں اپنا کچھ اختیار نہ ہو۔ اسے جیسے امر کیا جاتا ہے ایسے کرتا ہے اس کے اپنے ارادے کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ پھر وہ خواہ خانقاہ میں رہے مسجد میں رہے' سفر میں رہے یا حضر میں' ہر حال میں بنی نوع انسان کی خدمت میں لگا رہتا ہے' اور سب سے بڑی خدمت حق کی راہ دکھانا ہے۔ راہ دکھانے سے مراد حق پر چلانا اور حق کی منزل تک پہنچا دینا ہے۔ یہی مقام سعید ہے' یہی مرشد کامل کا مقام ہے جہاں پر بارگاہ کبریا سے براہ راست احکام وصول ہونے لگتے ہیں اور عاشق و معشوق' شاہد و مشہود' کاتب و مکتوب' اور دال و مدلول کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔

خلاصۂ تعلیم:

"شریعت دروازۂ اوّل است و طریقت دروازۂ دوم و حقیقت دروازۂ سیوم است و معرفت دروازۂ چہارم و عشق مقام خانۂ محبّتِ یگانہ است و ہر کہ در مقام شریعت طریقت' حقیقت' معرفت برود دربان بیگانہ است از حقّ۔ تا در محبّت محو نشود' محرم اسرار نگردد" (۴۲)

(شریعت پہلا دروازہ ہے اور طریقت دوسرا دروازہ اور حقیقت تیسرا دروازہ ہے اور معرفت چوتھا دروازہ اور عشق خدائے یگانہ کی محبت کے ٹھہرنے کا گھر ہے اور جو بھی شریعت' طریقت' حقیقت اور معرفت تک محدود رہتا ہے وہ حق سے بیگانہ دربان ہے۔ اسے درونِ خانہ کی کیا خبر۔ جب تک محبّت میں محو نہیں ہو جاتا محرم اسرار نہیں ہوتا۔)

خلاصۂ تعلیم پڑھ کر جدید دور کے ایک طالب علم کا ممکنہ تاثر: "لیجئے ہم تو کچھ اور سمجھتے رہے مگر یہ تو وہی پُرانی بات نکلی' صدیوں پہلے کی!"

www.yabahu.com

اس عزیز کے متوقع تاثر کے پیشِ نظر تقریباً سات سو سال پہلے مولانا جلال الدین محمدّ بلخی رُومی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

"بزرگوں کی باتیں اگر سو طریق پر ادا کرے تو بھی ایک ہی ہوتی ہیں۔ جب کہ حقّ ایک ہے، راستہ ایک ہے تو باتیں دوؔ کیسے ہو سکتی ہیں؟ لیکن اس کی صُورت مخالف ہوتی ہے، معنی ایک ہی ہیں، تفرقہ صرف صُورت میں ہے معنی میں سب جمعیت ہی ہے"

اب کوئی چاہے تو یہ نصیحت قبول کرے، چاہے تو مُنہ پھیر لے۔ (دوسری صورت میں اسے اس رسالے کا اگلا حصہ پڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی)۔

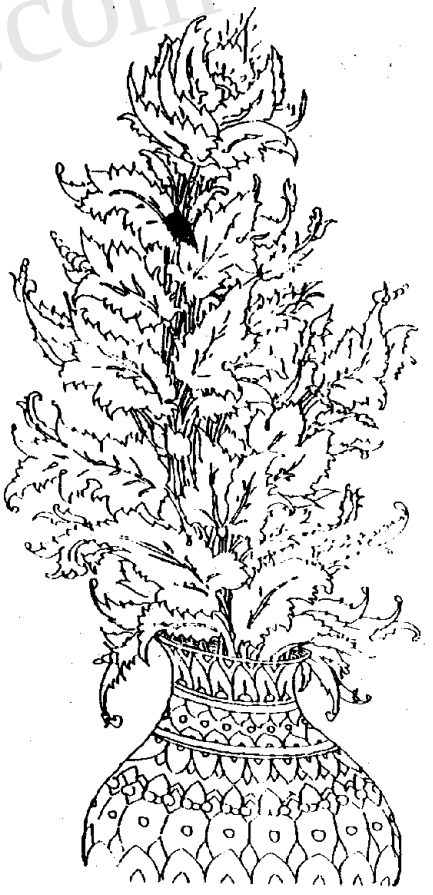

www.yabahu.com

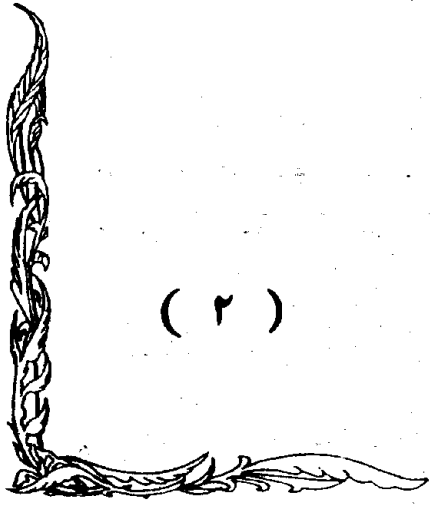

(۲)

میں نے اُس کے لئے آگ کو روشن کیا تو اُس نے اُس کی روشنی دیکھ لی۔ اگر میں آگ کو روشن نہ کرتا تو وہ اُسے دیکھ نہ پاتا۔

(اُس آگ نے) اُسے بغیر نام لئے پکار کر کہا "ضیافت کی طرف آ جاؤ" تو یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا رات کے وقت چل کر آ گیا۔ آگ (برابر) جل رہی تھی۔

جب اُس آگ نے اُس کے جسم کو واضح اور روشن کر کے دکھلا دیا تو میں نے اُسے کہا "مَرحبا! تشریف لائیے" اور اُن لوگوں کو جو آگ تاپ رہے تھے، کہا (اس مہمان کے آنے پر) "خوش ہو جاؤ"۔

چنانچہ وہ مہمان آیا اور وہی شخص جس کی مہمان نوازی کی لوگ تعریف کرتے تھے اُسے کھینچ کر آگ کی طرف لئے آ رہا تھا اور مُرغِ سَحر خیز اَذانِ سَحر دے رہا تھا۔

مَیں نے اُس سے کہا "تُو نے آنے میں تاخیر کر دی، یہاں تک کہ قریب تھا کہ تُو گھر والوں سے عُمدہ ضیافت حاصِل نہ کر سکتا مگر مہمان کا حقّ پیچھے نہیں رہ سکتا۔

(حَماسہ ـــــ ایک عرب شاعر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملاحظہ ایک:

ایک دوست نے کہا: تم نے جو کتابیں اب تک لکھی ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد جب آدمی آگے کی سوچتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے دروازہ بند ہے، راستہ نہیں ملتا۔ ایسا کیوں ہے؟

ملاحظہ دو:

"میں نے چھ ادیان، نفسیاتی اور سِرّی نظاموں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے جتنا کہ مَیں کر سکتا تھا اور کسی حد تک کئی دوسروں کا بھی۔ ہر بار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان سب سے کوئی نہ کوئی بات رہ گئی ہے....." (۴۳)

ملاحظہ تین:

"حضرت ابوحَامد احمد بن خضرویہ البلخی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا، راستہ واضح ہے اور حق روشن اور نگہبان بہت ہی اچھا سُننے والا۔ پس اس کے بعد حیرانی صرف دل کے اندھے پن کی وجہ سے ہی ہو سکتی ہے، یعنی راستہ ڈھونڈنا خطا ہے کیونکہ حق آفتاب کی طرح روشن ہے۔ تو اپنی تلاش کر کہ تو کہاں کھڑا ہے؟ جب تو اپنے آپ کو پا لے گا تو راہ پر آ جائے گا۔ کیونکہ حقّ اس سے زیادہ روشن ہے کہ طلب طالب کا سوال پیدا ہو" (۴۴)

ملاحظہ چار:

"اگر تو آئے تو دروازہ کُھلا ہے، اگر نہ آئے تو حقّ تعالیٰ بے نیاز ہے۔" (۴۵)

پہلے دو ملاحظات حلقۂ تصوف سے باہر کھڑے لیکن دلچسپی رکھنے والے شوقین

www.Yabahu.com

لوگوں کے ہیں جن میں پہلا تو ایک تصوف پسند دوست کا ہے جو محدود فکر اور غلط اندیشی پر مبنی ہے۔ جبکہ دوسرا اک تعلیمیافتہ نام نہاد ریسرچ سکالر کا ہے جو تصوف کو بھی ایسے ہی پڑھنا چاہتا ہے جیسے وہ دوسرے موضوعات کو کتابوں میں پڑھتا رہا ہے۔

عصرِ جدید کے ایک مرشد حضرت سیّد ادریس شاہ نے ایسے آدمی کے لئے حضرت مولانا روم کی نصیحت دہرائی ہے کہ کمی تم میں ہے' اس یا ان میں نہیں۔ پھر شاہ صاحب نے جواب دیا ہے۔ ایسے لوگ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کسی چیز کی کمی کے ادراک کے لئے یا اسے نامکمل محسوس کرنے کے لئے وہ بات جاننا بھی ضروری ہے جو کم ہے یعنی تمہیں مکمل چیز کا علم تو ہونا چاہیے۔ یہ استعداد بہم پہنچانے کے لئے پہلے اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں تمام ضروری معلومات ہونی چاہیں اور پھر تقابل علوم و ادیان سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مؤخر الذکر دو ملاحظات حلقہ تصوف کے دو رہبر بزرگوں کے ہیں جن کے پیچھے کئی صدیوں کی حکمت اور کئی سالوں کا ذاتی تجربہ کارفرما ہے۔ اس لئے ان کا ایک ایک لفظ سچ اور بالکل سچ ہے۔

راستہ بند ہونے کی شکایت اکثر سنی جاتی ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ شکایت کرنے والے کو خود اپنا پتہ ٹھکانا معلوم نہیں ہوتا۔ یعنی کہاں تک وہ آچکا ہے' کہاں آکر رک گیا ہے اور یہ روکاوٹ کہاں سے آئی ہے؟ وہ ادھر ادھر سے پڑھ سن کر یہ تو جان لیتا ہے کہ فقیری اور تصوف کے دائرے میں آکر آدمی دینی و دنیاوی برکات کا مالک بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ اس کی خواہش بھی کرتا ہے مگر اگلی بات نہیں سوچتا کہ اس دائرے میں داخل ہونے کے بھی کچھ قواعد و آداب ہیں اور ان میں پہلا قاعدہ یہ ہے کہ آیا ایسی خواہش رکھنے والا شخص واقعی اس دائرے میں داخل ہونے کے لئے تیار ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ تیار ہے تو کیا جن کے علاقے میں وہ جانا چاہتا ہے وہ بھی اس کی تیاری سے مطمئن ہیں۔ کیونکہ خود اپنے تئیں تیار سمجھنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا جب تک کہ اصل ذمہ دار معلمین اسے اپنی جماعت میں داخلے کے قابل نہ سمجھیں۔

تیاری اور داخلے کی قابلیت کا معیار بظاہر بہت آسان ہے مثلاً" طالب حق کی تیاری یہ ہے کہ "کسی شخص یا کسی چیز کے ذریعے وہ اتنا کچھ ضرور سمجھ چکا ہو کہ علم (تصوف) کی موجودگی کا ادراک کر سکے۔ کیونکہ اس کے بغیر تعلیم حاصل نہ ہو گی۔" اس غرض سے یہ بہت ضروری ہے کہ اس نے کچھ متعلقہ کتابیں پڑھ رکھی ہوں۔ کرامات کے ذکر اور قصے کہانیوں سے ہٹ کر صوفیاء کے کچھ اقوال و احوال کا علم رکھتا ہو یا کم از کم فقیروں اور درویشوں کے پاس کچھ وقت بیٹھتا رہا ہو۔ اب رہی معیار کی بات تو وہ خود اس کی طلب کے تجزیہ کے بعد سامنے آئے گی۔ یہ دیکھا اور پرکھا جائے گا کہ آیا یہ طلب محض ایک جذباتی خبط تو نہیں یا اسے محض بے معنی تجسس' ذہنی نفسیات کے سراغ یا وجدانی اسرار کے کشف کی تمنانے تو ادھر نہیں دھکیل دیا یا پھر اسے کسی ایسے جسمانی و ذہنی یا روحانی بحران سے سابقہ تو نہیں پڑا کہ وہ لڑھک کر فقیروں کے حلقے میں آگرا ہے۔ ان عوامل میں سے کوئی بات بھی محرک ہو سکتی ہے۔ بایں ہمہ داخلے کے فیصلے کا دار و مدار معلم حلقہ پر ہی ہو گا۔

زیادہ تر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس تعلیم کا متلاشی آیا واقعی طلب میں مخلص اور غیر جذباتی رویے کا حامل ہے۔ ایسا ہو یا نہ ہو تب بھی اگر کوئی یہاں آجائے تو اسے دھتکار کر نکالا نہیں جاتا۔ لوگ طالب حق بن کر آجاتے ہیں۔ پھر دو ہی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یا تو ان میں سے کچھ تعلیم میں مستقل انہماک اور محنت و ریاضت کے بعد کامل بن کر نکلتے ہیں اور دوسرے خود بخود اکتا کر باہر نکل جاتے ہیں۔ خس کم' جہاں پاک۔

اب نظام تصوف میں تعلیمی تثلیث یوں بنتی ہے۔ تصوف' طالب' معلم یا مرشد

تصوف سیکھنے کی چیز ہے۔ یہ ایک زندہ روحانی روایت ہے جو گہری دین داری کے باطنی احساس سے متعلق ہے۔ لہٰذا اس میں حق کی یافت مقصود ہوتی ہے۔ جو آدمی اس روایت کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہر قسم کے چکر سے باہر

www.yabahu.com

نکل آتا ہے۔ اور ہرشے کی حقیقت کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے لگتا ہے۔ دین و دنیا کے بارے میں اس کا نکتہ نظر یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر یقینی طور پر اس کے معمولات زندگی پر پڑتا ہے۔ جو ابتداء میں تھوڑی سی گڑ بڑ کے بعد ایک خاص وضع پر آ جاتے ہیں ابتداء میں یہ گڑبڑ اس لئے ہوتی ہے کہ درویش جن چیزوں کو عام طور پر پہلے کامیابی کا ضامن سمجھتا رہا ہے جیسے مقابلہ' عجلت' تیزی طبع' بے لگام طمع' کاروباری داؤ پیچ' خواہش مال و آسائش' حب نقد و رقم' چالاکی و عیاری وغیرہ۔ اب یہ سب چھوڑ کر ان کے الٹ بعض باتوں کو اپناتا ہے۔ جیسے ایثار' دوسروں کے فائدے کا پاس اور لحاظ' خواہش کی حد بندی' جائز و ناجائز کی تمیز' نقد و رقم کی قدر محض بطور وسیلہ' آدمیت و شرافت' دوسروں کی امداد اور دستگیری وغیرہ۔ فہم و ادراک اور اس کے مطابق عمل میں تبدیلی کے ایک درمیانی وقفے میں اس طرح کی الٹ پلٹ میں کچھ نقصان کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ لیکن بندہ اگر اس کو جھیل گیا اور گذر گیا تو سمجھو کہ اس کا ایک قدم حق کی طرف اٹھ گیا۔۔۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ اور یاد رہے کہ یہ ایک قدم بعد کے ستر قدموں سے بھی زیادہ اہم ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا اور دوسرا قدم طالب حق کو تصوف کے دائرے کے عین اندر لے آتا ہے۔

حلقۂ تصوّف میں طالب حق کو پہلے تحصیل علم کے لئے مناسب وقت' با برکت جگہ یعنی خانقاہ' مسجد یا مدرسہ اور حلقۂ درویشاں (زبان' مکان و اخوان) سے مانوس ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ اگر وہ پہلے اس علم کی طلب کے لئے تیار ہو تو اپنے اندر ایک عجیب سی مسرت اور کیف محسوس کرتا ہے۔ جیسے مدت کا پیاسا کسی نہایت ہی خوشگوار پانی کے چشمے پر آ پہنچا ہو' کچھ وقت کے بعد اس نئی دنیا میں جب طبیعت آشنائی اور پھر آموزش کی طرف پوری طرح مائل ہوتی ہے تو معلم اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور سیکھنے کی ابتداء ہوتی ہے۔

اس توجہ اور آموزش کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ

۱۔ معروف طریقے کے مطابق پہلے طالبان حق کے اخلاق درست کئے جاتے ہیں۔ ان

کی نفسیاتی الجھنوں کے سلجھاؤ میں ان کی مدد کی جاتی ہے۔

۲۔ نکات تصوف سیکھنے کے لئے مؤثر اور بعض اوقات غیر معمولی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

۳۔ عقل و عمل کے اطوار میں تبدیلی لائی جاتی ہے۔

۴۔ سوچ سمجھ اور پہچان کی نئی راہیں ان پر کھولی جاتی ہیں۔

۵۔ حق بینی کی جہت کی طرف نہ صرف رہبری کی جاتی ہے بلکہ اس پر چلایا جاتا ہے۔

۶۔ عبادت اور ذکر کے موزوں طریقے بتائے جاتے ہیں۔

۷۔ روحانی احوال سے آگے کی منزلوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۸۔ اطمینان کے ساتھ دین و دنیا میں آگے بڑھنے کے اوصاف واضح کئے جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ طالب حق یہ جان لیتا ہے کہ اب وہ نیک بختی کی راہ پر ہے جس کا انجام بھی نیک بختی پر ہوگا ---------

تصوّف راستہ ہے جو واضح ہے

حقّ ہے جو روشن ہے

شفا خانہ ہے جہاں نفس و قلب کے امراض کا علاج ہوتا ہے۔

مدرسہ ہے' جس میں اعلیٰ درجے کی تعلیم کا ایک غیر مُرتّب نِصاب پڑھایا جاتا ہے جس کی تحصیل طالب کی ہمت' استعداد اور محنت پر منحصر ہے۔

قادریہ سہروردیہ' شاذلیہ' چشتیہ' نقشبندیہ طریقے کلاسیکل تصوّف کی مؤثر اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے اپنے مدرسے رکھتے ہیں جو کسی مرشد کی نگرانی میں تصوّف کے تعلیمی عمل کا ماحول پیش کرتے ہیں۔ طالب حق کو اختیار ہے کہ وہ جسے اپنے مزاج اور معیار کے مطابق پائے' داخل ہو جائے۔ البتہ انتخاب کے موقعہ پر چھلکے اور مغز نیز اصل اور نقل کی تمیز بہت ضروری ہے۔

مگر طالب کہاں ہے؟ اور کہاں کھڑا ہے؟

طالب ایسے ہی نہیں بن جاتے کہ کہیں سے کوئی خیال آیا اور درویش بننے

www.yabahu.com

چل دیئے۔ درویشی اور فقیری کے لئے پہلے طلب کے ذوق و شوق میں پختگی اور استقلال کا جائزہ اشد لازم ہے۔ مسلمان حکومتوں کے عہد میں کلاسیکل نظام کا اختتام حصول سلوک و تصوف پر ہوتا تھا۔ یعنی جب طالب علم کو سند فضیلت مل جاتی تھی تو اسے ہدایت کی جاتی تھی کہ اب کچھ مدت صوفیاء کرام کی صحبت میں جا کر رہو۔ وہ جو کچھ سکھاتے ہیں، ان کے پاس جا کر سیکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں فقہاء، محدثین، مفسرین اور دیگر ارباب علوم و فنون کسی نہ کسی طرح تصوف اور صوفیاء سے ضرور نسبت رکھتے تھے۔ مگر اب وہ حال نہیں رہا "وہ ایک جماعت تھی، گذر گئی" (۴۶)

وقت گذر گیا، نظام بدل گئے۔ اور طالب حق کی تیاری کے طریقے نئے سرے سے مرتب ہوئے۔

آج کے طالب کو، اگر وہ پڑھا لکھا ہے تو سیدھے کسی حلقۂ تصوف میں جا گھسنے سے پہلے تصوف پر کچھ کتابیں ضرور پڑھ لینی چاہیں۔ مثلاً

رسالہ قشیریہ	حضرت عبدالکریم القشیری
کشف المحجوب	حضرت سید علی بن عثمان الہجویری
عوارف المعارف	حضرت عمر بن محمد سہروردی
تعرف	حضرت ابوبکر الکلاباذی
کیمیائے سعادت	حضرت محمد غزالی
فوائد الفواد	حضرت حسن سنجری
عین الفقر	حضرت سلطان باھو
نورالہدٰی	حضرت سلطان باھو (رحمتہ اللہ علیہما)

وغیرہ

بے شک بیشتر مندرجات ابتدائی مطالعہ میں سمجھ میں نہ آ سکیں گے مگر اس کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے۔ بس ہو سکے تو ضبط اور جذباتیت سے دور رہ کر ان کتابوں کو بار بار پڑھنا چاہیے اور اپنی طرف سے اپنے مطلب کے مطابق ان سے

معنی اخذ نہیں کرنے چاہیں بلکہ اگر کوئی تصوف کا جاننے والا مل جائے تو اس سے مشکل باتوں کا مطلب جاننے کے لئے پوچھنے سے نہیں جھجکنا چاہیے۔ وہ جو کچھ بتائے، اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے ایسی تیاری بھی کسی ایک یا ایک سے زائد صوفیوں کی نگرانی میں ہو گی خواہ یہ بے قاعدہ نگرانی ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ تیاری میں خامی یا خلا رہ جانے کا امکان ہے۔

تاکید مزید:

حلقۂ تصوف میں کچھ حالتیں اور عادتیں بدلنا پڑتی ہیں یا چھوڑنی پڑتی ہیں۔ یہاں پہنچنے سے پہلے آدمی کو اپنی ذہنی و اخلاقی کیفیات سے کچھ آگاہ ہونا چاہیے۔ کچھ کتابیں پڑھنے سے یہ آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً" امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کو ضرور پڑھا جائے۔ اگر جدید دور کا تعلیم یافتہ آدمی یہودی نفسیات دان فرائیڈ اور اسکے شاگرد یونگ کو ہی پڑھ لے تو وہ بھی کسی حد تک نفس کی خباثتوں اور اپنی نفسیات کی کجروی کو سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ نفسیاتی الجھنوں کا سلجھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ کوئی نہ کوئی کل ضرور ٹیڑھی رہ جائے گی۔

اس دور کے ایک دانش مند صوفی نے فرمایا ہے۔ "تلخ سچائی یہ ہے کہ آدمی کو اپنی نااہلیت یا دوسرے آدمی یا ادارے کی قابلیت کو جانچ سکنے سے پہلے ایسا کچھ ضرور سیکھ لینا چاہیے کہ وہ ان دونوں باتوں کا ادراک کر سکے۔ خوب یاد رہے کہ یہ ادراک بھی درست مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی فرد سے جبلی یا جذباتی کشش کی وجہ سے نہیں اور نہ اکیلے ہی سب کچھ کر گزرنے کی تمنا کی بنا پر۔ یہ ہے سیکھنا کہ کیسے سیکھا جاتا ہے۔" پھر کہا ہے۔ "ایک غیر منظم اور بے ڈھنگا ذہن جو اکثر لوگوں کا موروث ہوتا ہے، سچ کے احساس کی خوبی اور مقدار کو بگاڑنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ نتیجہ" ایسا ذہن، کیا کیا جائے یا کیا کیا جانا چاہیے، کے بارے میں تقریباً بالکل ہی غلط نتائج اخذ کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔" (۴۷)

طالب پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ تصوف محیّرالعقول واردات، کشف و کرامات

www.yabahu.com

پُر سرور مراقبات اور حیران کُن احوال و مقامات کی پُر اسرار دنیا سے زیادہ ایک تعلیم و تربیت کا ادارہ ہے جہاں یہ سب باتیں ہوتی تو ہیں مگر اکثر ذہن اور دماغ کو گرفت میں لے کر اپنی قید میں لے آتی ہیں، جس کے نتیجے میں طالب حق یہیں کہیں راہ میں رہ جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ بہت بڑا ولی یا فقیر بن گیا ہے۔ ظاہر تعلیم میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کم پڑھا لکھا اپنے تئیں بہت پڑھا لکھا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سب حماقتیں ہیں۔

کام کی باتیں ہیں تو بس شوق، ہمّت، اِستقلال، بُلند نظری اور روشن ضمیری۔
آگے پھر سعادت ہے جس کے آگے پیچھے کرامت اور مغفرت ہیں۔

جب طالب نے طلب کے لئے ہاتھ اوپر اٹھا کر پھیلا دیئے تو پھر مرشد کا ہاتھ برآمد ہو گا۔ ”جنھوں نے محنت کی ہمارے واسطے، ہم سُجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں۔ اور بے شک اللہ ساتھ ہے نیکی والوں کے“۔(۶۸)

اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ کوئی مردِ حق یا مُرشدِ کامل بتاؤ؟ آج کل کوئی ایسا بندۂ خُدا ہے تو اس کا پتہ دو!؟

یہ سوال ہے تو بہت ضروری مگر ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ سوال کرنے والا کہاں کھڑا یہ سوال کر رہا ہے۔ کیا اس سے پہلے وہ ایک دو قدم اٹھا چکا ہے؟ اگر ایسا ہے تب اسے یہ سوال کرنے کا حق تو ہے مگر اصرار پھر بھی نامناسب ہو گا۔ کیونکہ اب حق تعالیٰ کی رحمت اس کے لئے بہر صورت ہدایت کا سامان پیدا اور مہیا کرے گی (ہم سوجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں) البتہ اسے اپنی طرف سے شرط کا کوئی اختیار نہیں کہ ہدایت اس طرح نہیں، فلاں طریقے سے پہنچے۔ اگر وہ کچھ شرائط کا دعویدار بنا تو پھر وہ جانے اور اس کا کام ـــــ مشکل ہی سے کام بنے گا۔ یہاں تو مجسم سوال بن کر خاموشی سے انتظار کرنا سنہری اصول ہے۔ اور پھر مرشد کہیں سے از خود سامنے آ جائے گا۔ طالب حق اسے اتفاق سمجھے گا مگر وہ خود بھی کبھی بعد میں اوپر سے نظر ڈالے گا تو اسے یہ معاملہ اتفاق نہیں بلکہ عین الٰہی مصلحت نظر آئے گا۔

پھر بھی کچھ سوالات

پہلا سوال” مرشد کیسا ہونا چاہیے؟

بس ایک عام سا بندہ خدا، جادو گر ہی نظر آئے نہ کوئی پر اسرار ہستی اور نہ ہی اپنے گرد غیر ضروری آداب یا کسی تعجب خیز قوت و کرامت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ واعظ اور مدرس بے شک ہو مگر نعرے بازی اور مناظرہ و مجادلہ کے اجتماعات کا اہتمام ہرگز نہ کرتا ہو۔ اس کی ہر بات میں اس کی تعلیم کا جوہر، خلوص اور صداقت جھلکنی چاہیے۔ اپنے حلقے سے باہر بھی ایک نیک اور معقول آدمی کی شہرت رکھتا ہو۔

دوسرا سوال: پھر بھی کوئی ظاہری نشانی؟ کوئی گدڑی، کوئی تسبیح وظائف، حجرے، کشکول، مریدوں اور خادموں کا جھرمٹ وغیرہ؟

ان میں سے کوئی بھی نہ ہو تو اچھا ہے۔ یہ رسوم و تکلفات سب ظاہری اور خارجی ہیں، جو دام فریب بھی ہو سکتی ہیں۔

تیسرا سوال: وہ کہاں ملے گا؟

کہیں بھی، وہ مسجد میں بھی ہو سکتا ہے، خانقاہ میں بھی کسی معین جگہ پر بھی ہو سکتا ہے، اور غیر متعین جگہ پر بھی۔ ایوان حکومت میں بھی ہو سکتا ہے اور جدید دور کی کسی درسگاہ میں بھی۔ کروڑ پتی بھی ہو سکتا ہے اور ایک مسکین زاویہ نشین بھی۔ مسافر بھی ہو سکتا ہے اور مقیم بھی۔ وہ آپ کو ایسی جگہ بھی مل سکتا ہے جہاں آپ کو توقع بھی نہ ہو۔

بس طلب کی شرائط پوری کرنے کے بعد اس کے ظہور کے منتظر رہئے۔ وقت آئے گا کہ یا تو آپ اس کی طرف کھنچے چلے جائیں گے یا وہ آپ کی طرف بڑھتا چلا آئے گا۔ آپ جس شعبے سے جائیں گے وہ آپ کو اسی شعبے کے حوالے سے اپنے قریب لے آئے گا۔

چوتھا سوال: مل جائے تو اس کی کوئی پہچان؟

اس سے پہلی ملاقات میں ہی آپ محسوس کریں گے کہ تصوف ایک زندہ روایت ہے جس کا تعلق براہ راست دین کے باطن سے ہے اور وہ اس روایت کا صاحب حال نمائندہ ہے۔ وہ پہلے ہی دن آپ کو چند ایسی باتیں بتا دے گا جو آپ تصوف کی کتابوں میں پڑھی تو ہوں گی مگر سمجھ نہ پائے ہوں گے کیونکہ وہ صرف اسے ہی معلوم ہوتی ہیں جو صاحب امر اور معلم وقت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ چند دن کی صحبت آپ کے اندر ایسی قوتیں بیدار کر دے گی کہ آپ خود حیران رہ جائیں گے کہ آپ کی فطرت میں یہ بھی ودیعت کی گئی تھیں۔ آپ اپنے تئیں ایک نئے جہان میں محسوس کریں گے۔ وہی آپ کو بتائے گا کہ روایتی تصوف کے کون سے اجزاء کسی خاص دور کے لئے موزوں تھے' اب قابل عمل نہیں رہے' نیز کون سے حصے تعمیری اور بنیادی ہیں جن کی اب بھی بدستور ضرورت ہے۔ اور علم و معرفت کی کونسی نئی راہیں کھل چکی ہیں جو ہماری صُوفیانہ روایت کے عین مطابق ہیں اور ان کے بغیر فلاح نوعِ انسان کا کام عمل پذیر نہیں ہو سکتا۔

آپ کی تعلیم اور صُحبت کے زیر اثر کچھ دن کے بعد آپ کا نہ صرف طرزِ فکر بدل جانا چاہیے بلکہ آس پاس کی چیزوں اور حالات کو دیکھنے کا ذریعہ بھی کچھ اور ہو جانا چاہیے یہاں تک کہ زندگی کے معمولات بھی پہلے کی طرح نہ رہیں اور وہ کچھ حاصل ہونے لگے جس کا ادراک زندگی کے عام تجربات و مشاہدات کے ذریعے ممکن نہیں۔

یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ آیا ایسا مرشد نظریے کے ساتھ نظر بھی رکھتا ہے' اسے مریدوں کی طبیعت اور مزاج کے مطابق استعمال کر سکتا ہے اور اس کے گرد تعلیم کا کوئی صحیح ماحول ہے۔ اگر ایسا ہو تو مناسب ہو گا کہ اپنے تئیں اس کے حوالے کر دو

پہچان کے لئے کوئی اور بات؟

ایک نہیں' بہت باتیں ہیں مگر آج کے دور کے پیش نظر' یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ اس کی صحبت میں موت کا خوف نہیں رہے گا رنج و غم کے اندیشے ہیچ نظر

آئیں گے۔ اور بے خوفی و آزادگی میں عجیب لطف ملے گا۔

پانچواں سوال۔ مُرشد یا معلم سے سیکھنے کے آداب و قواعد؟

اگر اوپر بتائی ہوئی باتیں ظاہر ہونے لگیں اور آپ سمجھ لیں کہ یہ سب اس کا فیض ہے تو بس اس کی صُحبت میں یا اس کے قریب رہنے کی کوشش کیجئے۔ اس کے لئے وقت نکالیئے۔ اس کی سُنیئے اور جو کچھ وہ کہے۔ اس طرح کیجئے۔

چھٹا سوال .....؟

ایک سوال اور.....؟

پھر ایک اور .....؟

نہیں' اب سوالات بند' بہت باتیں ہو چکیں۔ یہ بھی نہیں کہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا نہ ہوں گے۔ بلکہ اب کچھ یُوں ہو گا کہ آپ کو پوچھے بغیر ان کے جوابات ملتے جائیں گے۔

اے لِقائے تو جوابِ ہر سَوال!
مُشکلِ آساں شَود بے قِیل و قَال

(۴۹)

خاص طور پر وہ سوالات جو ابتداء میں اپنی ذات' خالق و مخلوق اور ان سب کے مُنتہا و مقصد کے بارے میں کبھی اُٹھے تھے' ان کے پُر از یقین جوابات نہ صرف مل جائیں گے بلکہ ایسے ذہن نشیں ہوں گے کہ اب ان کے دوبارہ اُٹھنے اور پریشان کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ ہر نکتہ' ہر فصل' ہر باب اور ہر چھوٹا بڑا مضمون ترتیب کے ساتھ ذہن و دماغ اور روح کی گہرائیوں میں سما جائے گا۔ اور جہاں سمائے گا وہاں روشنی پیدا ہو جائے گی۔ اب جو بات ہو گی' یقین کے آخری درجے سے ہو گی۔ سنی سنائی نہیں' صرف دیکھی ہوئی بھی نہیں بلکہ برتی ہوئی' خود آزمائی ہوئی۔

اب آگے کے لئے ادب یہی ہے اور تصوّف بھی یہی کچھ ہے کہ دیکھتے جایئے اور صبر کے ساتھ اپنے مرشد و معلم سے کام کی باتیں سیکھتے جایئے۔ یہاں

www.yabahu.com

تک کہ آپ پر اپنی اصل آدمیت ظاہر ہوجائے۔ اور آپ خود بھی جان لیں کہ اب میں محض نقل نہیں رہا بلکہ اپنے اصل ذہن اور دماغ سے کام لے کر کاروبارِ ظاہر و باطن میں مصروفِ عمل ہوں ——— ایسا ہو جائے تو اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ آپ کو یہ "خاص الخاص تعلیم" میسر آئی جو نبیوں اور ولیوں کی تعلیم ہے۔ اور جس کا اختتام کو ایک طرح پر سعادت و ولایت کی منزل پر ہوتا ہے لیکن در حقیقت اس کا کوئی اختتام نہیں ———

آگے محبت ہے۔ محبت میں محویت ہے۔ اس محویت میں "اسرار ہائے عجیبہ" اور "لطیفہ ہائے غریبہ" ہیں "تادرِ محبت محو نشود، محرمِ اسرار نگردد" (۵۰)

اور "ابحارِ استغراق" ———

"پرتوِ شعاعِ حضرتِ کبریاء بندہ را ذرّہ وار در ابحارِ استغراق مستغرق ساخت" (۵۱)

(حضرتِ کبریاء کی شعاع کے عکس نے بندہ کو ذرّہ کی طرح استغراق کے سمندروں میں مستغرق کر دیا)

ooo

حوالے

۱۔ مستعار جملہ ۔ قرآنِ حکیم کی تین سورتیں ۔ ادبستان، لاہور۔ مارچ ۱۹۶۹ء

2. Philosophy a Critique p.21 Syed Zafarul Hasan.

Institute of Islamic Culture Lahore 1988.

3. " P. 210

۴۔ تقریر البرٹ ہال، کلکتہ یونیورسٹی، ۸ نومبر ۱۸۸۲ء بحوالہ اشاعتِ ملّی ایڈیشن، نوائے وقت ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء

5. The World of Philosophy Edited by C.A. Qadir Club Road, Lahore, 1965.

Article: The Vadantic conception of man by T.m.p. Mahadevan p .150.

۶۔ قرآن مجید ۔ آل عمران ۔ ۱۹

۷۔ قرآن مجید ۔ الانعام ۱۴۳

۸۔ تفسیر ماجدی ۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی

۹۔ قرآنِ مجید ۔ الانعام ۱۰۳

۱۰۔ قرآن مجید ۔ السجدہ ۴

۱۱۔ قرآن مجید ۔ سورہ یٰسین ۸۲

۱۲۔ قرآن مجید ۔ حٰمٓ سجدہ ۱۱

۱۳۔ قرآن مجید ۔ الدخان ۱۰

۱۴۔ قرآن مجید ۔ الانبیاء ۳۰

۱۵۔ قرآن مجید ۔ ھود ۷

۱۶۔ قرآن مجید ۔ الانبیاء ۳۰

۱۷۔ قرآن مجید ۔ الرحمن ۱۴

۱۸۔ قرآن مجید ۔ الحجر ۲۹، ص ۷۲

۱۹۔ قرآن مجید ۔ الاسراء ۷۰

۲۰۔ قرآن مجید ۔ الانعام ۱۶۵

۲۱۔ قرآن مجید ۔ البقرہ ۲۷

۲۲۔ قرآن مجید ۔ البقرہ ۳۴

۲۳۔ قرآن مجید ۔ الجاثیہ ۱۳

۲۴۔ قرآن مجید ۔ فاطر ۴۱

۲۵۔ قرآن مجید ۔ المؤمنون ۱۷

۲۶۔ قرآن مجید ۔ الزمر ۱۳

۲۷۔ قرآن مجید ۔ الانعام ۵۹

۲۸۔ قرآن مجید ۔ الرعد ۲

۲۹۔ قرآن مجید ۔ الانبیاء ۵

۳۰۔ قرآن مجید ۔ الاعراف ۷

۳۱۔ قرآن مجید ۔ التین ۳

www.yabahu.com

۳۲ـ تفسیر ـ مولانا ابوالکلام آزاد

۳۳ـ قرآن مجید ـ الشمس ۸

۳۴ـ قرآن مجید ـــــــ البلد ۱۰

۳۵ـ مولانا ابوالکلام آزاد

۳۶ـ قرآن مجید ـ الذّاریات ۵۶

۳۷ـ قرآن مجید ـ الملک ۲

۳۸ـ قرآن مجید ـ الروم ۱۱

۳۹ـ رِسالہ رُوحی از حضرت سُلطان باھُوؒ ـ حضرت غُلام دستگیر اکیڈمی

۴۰ـ قرآن مجید ـ المؤمنون ۱۴

h۴۱ (اللّٰھم لرنا الحقّ حقّاً ولرزُقنا تباعه ولر نا الباطل باطلا ولرزقنا اجتنابه اللّٰھم لرنا حقائق الاشیاء کماھی) (اَوَر اِد فتحیہ ـ ملک سراج الدّین اینڈ سنز ـ لاہور)

۴۲ـ عینُ الفقر از حضرت سُلطان باھُوؒ باب پنجم

43- Evenings with Idries Shah - Lahore - 1981 ـ۴۳

۴۴ـ کشفُ المحجوب از حضرت سیّد علی بن عثمان الہجویری

۴۵ـ عینُ الفقر از حضرت سُلطان باھُوؒ

۴۶ـ قرآن مجید ـ البقرہ ۱۳۴

47- Learning how to learn by Idries Shah P. 287 London 1980 ـ۴۷

۴۸ـ قرآن مجید ـ العنکبوت ۶۹

۴۹ـ مولانا روم ـ مثنوی ـ دفترِ اوّل

۵۰ـ عینُ الفقر ـ حضرت سُلطان باھُو رحمتہ اللہ علیہ

۵۱ـ رِسالہ رُوحی ـ حضرت سُلطان باھُوؒ ـ حضرت غُلام دستگیر اکیڈمی، دربار سُلطان باھُوؒ، ضلع جھنگ

www.yabahu.com